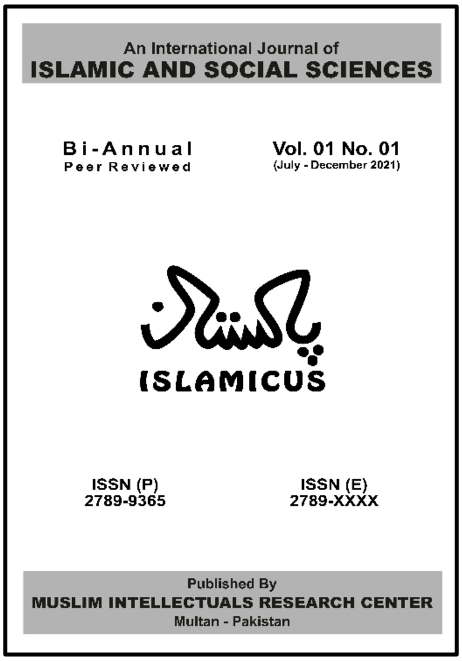
Pakistan Islamicus An International Journal of Islamic and Social Sciences
(Bi-Annual)
Trilingual: Urdu, Arabic and English
pISSN:2789-9365 eISSN:2789-XXXX
https://pakistanislamicus.com/index.php/home
Published by:
Muslim intellectuals Research Center
Multan-Pakistan
Website:www.pakistanislamicus.com



TOPIC

مذہبی قیادت۔ مسلم افکارِ سیاسی کے تناظر میں؛ تحقیقی جائزہ

Religious Leadership in the Context of Muslim Political Thought: Research Review

AUTHORS
Tahira Ramzan
Lecturer
Riphah International University Lahore Campus.
Email: tahiraramzan123@gmail.com

How to Cite

Ramzan, T. (2021).
Religious Leadership in the Context of Muslim Political Thought: Research Review
Pakistan Islamicus, *1*(01),
Pages 16–40.
Retrieved from
https://pakistanislamicus.com/index.php/home/article/view/12

مذہبی قیادت۔ مسلم افکارِ سیاسی کے تناظر میں؛ تحقیقی جائزہ

Religious Leadership in the Context of Muslim Political Thought: Research Review

Tahira Ramzan
Lecturer
tahiraramzan123@gmail.com
Riphah International University Lahore Campus.

Abstract

Leadership in Islam is rooted in belief and willing submission to Allah's Creator. And we made them leaders, guiding our command; and We inspired them to do good work, observe the prayer, and give out charity. They have devoted savant to Us (Allah). (Al-Qur'an, 21:73) .The Holy Qur'an provides very clear teachings on leadership. In modern times, man is fed-up with his system. Every system seems to reject the self-made system. These waves of reversal have solved the problems of humanity and have created new problems. In these circumstances, only Islam can save the oppressed humanity because Islam is the bearer of an ideology of unity that transcends tribes, races and national constraints and is the guarantor of the welfare and salvation of humanity. Every political body in the world has a purpose, which is considered the goal of its actions and deeds. This purpose brings together the demands of the environment, good intentions and true hopes at one point. This content analysis method is based on a review of the literature and other secondary data. The information in this chapter expectedly will give understanding on the importance of the Islamic leadership concept and can be useful or as a reference for further studies.

Key Words: خلافت، اقتدارِ اعلیٰ، حکومت، امامت، سیاست

ابونصر محمد بن ترخان انصار کی پیدائش ترکی کے مقام واسج میں 870ء میں ہوئی۔ ترکی کے دریائے جیحون کا ایک ساحلی علاقہ ہے جہاں واسج واقع ہے۔ اسی تعلق سے وہ فارابی کہلایا۔ آپ کی کنیت ابونصر ہے۔

فارابی دنیائے اسلام کا مشہور ترین فلسفی اور مفکر ہے۔ آپ نے تقریباً تمام علوم متداولہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ البتہ اس کی فلسفہ ومنطق کی تصانیف نے دوسری کتب کے نسبت زیادہ شہرت حاصل کی۔ فارابی، ارسطو کے شارح کی حیثیت سے بہت مشہور ہے اور اسی وجہ سے وہ معلمِ ثانی کہلایا۔ فارابی نے ارسطو کی کتاب "اخلاقیات" پر بھی تبصرہ لکھا اور افلاطون کی کتاب "قانون" کا خلاصہ تیار کیا، سائنس "طبیعات" کیمیا سب ہی مضامین پر فارابی کی کتب مشہور ہیں۔ منطق کے حوالے سے "مشرج الساغوجی" مشہور ہوتی۔ ہمارے پیشِ نظر سیاسیات کا موضوع ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے فارابی نے درج ذیل کتب تحریر کیں۔

1۔ سیاست المدینہ (افلاطون کی کتاب نومیس (قانون) کی تلخیص)

2۔ آراء اہلِ المدینہ الفاضلہ

3۔ جوامع السیاست

4۔ اجتماعات المدینۃ۔[1]

ان تصانیف میں سیاست المدینہ اور آراء اہل المدینہ الفاضلہ نے زیادہ شہرت حاصل کی اوران ہی دونوں کتابوں میں فارابی نے اپنے تمام سیاسی افکارو نظریات بیان کیے ہیں۔ان کتب میں رئیس اوّل کی اہمیت وصلاحیت پر خصوصی بحث کی گئی ہے۔

فارابی مملکت کو انسانوں کے ایک معاہدہ عمرانی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔اس کے نزدیک انسان کی جنگ جو فطرت کے باعث وجود میں آیا۔مملکت کے قیام سے پہلے طاقتور کمزوروں پر زیادتیاں کرتا تھا جس کی وجہ سے جھگڑے اور فتنے فساد برپا ہوئے۔اس خلفشار سے انسان عاجز آگیا اور ہر ایک نے اپنی مرضی سے اپنے حقوق کا ایک حصہ ایک مرکزی قوت کے سپرد کر دیا۔

اس طرح فارابی اس نظریۂ مملکت کا بانی ہے جسے اس کے انتقال کے سات سو سال بعد انگلینڈ اور فرانس میں قبولیت حاصل ہوئی۔اہلِ یورپ ترکِ حقوق باہمی کا سہرا ہابس کے سر باندھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ فارابی نے ہابس، لاک اور روسو سے بہت پہلے خامیوں سے پاک نظریۂ مملکت پیش کیا۔ہابس اور فارابی کے نظریات میں فرق یہ ہے کہ فارابی نے اس نظریہ کی بنیاد جنگ وجدل پر رکھی جبکہ ہابس کے نزدیک ایک دوسرے پر شک وشبہ کے باعث یہ نظریہ وجود میں آیا۔ہابس کا نظریہ شخصی حکومت کی طرف رہنمائی کرتا ہے جبکہ فارابی اس کے ذریعے ایک جمہوری نظام کو وجود میں لانا چاہتا ہے۔فارابی یورپی مفکرین کے مقابلے میں حقیقت سے زیادہ قریب ہے، اس کے نزدیک یہ معاہدہ حاکم ومحکوم کا نہیں بلکہ افراد کا باہمی معاہدہ ہے۔[2]

فارابی نے معیاری مملکت کا نظریہ پیش کیا اور اپنی معیاری ریاست کو "المدینہ الفاضلہ" کا نام دیا۔اس ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ کو وہ "الرئیس الاوّل" کہتا ہے:

"فارابی کے نزدیک مقتدرِ اعلیٰ کو سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ قوی ہونا چاہیے۔"[3]

فارابی اقتدار اعلیٰ کی بابت نہایت واضح ہے۔

فارابی کہتا ہے کہ:

رئیس الاوّل دوسروں کی بہ نسبت نتائج اخذ کرنے میں اور اصولوں کے متعین کرنے میں مہارت رکھتا ہو۔فارابی کہتا ہے کہ تمام انسان مساوی عقل نہیں رکھتے۔"یہ قوتِ استنباط ہی قیادت اور اقتدار کی جان ہے۔" صرف نتائج کا اخذ کرنا کافی نہیں بلکہ مستنبط نتائج کو دوسروں تک پہنچا دینا بھی ضروری ہے۔"[4]

---

[1] ۔ صلاح الدین ناسک، افکارِ سیاسی مشرق ومغرب، عزیز پبلیکیشنز، لاہور، 1973ء، ص:468

Sal āh-ud-din Nāsik,Afkār e Siyāsi Mashriq o Maghrib. Aziz Publications.Lahore,1973,p 468

[2] ۔ پروفیسر رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، 1988ء، ص:62-63

Professor Rasheed Ahmad,Musalmanon ky Siyasi Afkaar,Adara e Saqafat e Islamia,Lahore,1988,p 62-63

[3] ۔ فارابی، ابو نصر محمد، آراء کل المدینہ الفاضہ، بیروت، 1959ء، ص:5

Fārabi,Abu Nasar Muhammad, Aāra kul Al-Madinah Al-Fāza, Bairoot, 1959, p 5

[4] ۔ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:64

Rasheed Ahmad, Musalmano ky syāsi Afkār,p 64

فارابی کا کہنا ہے کہ فردِ واحد تمام شعبہ ہائے زندگی میں ان دونوں قوتوں کا مالک نہیں ہو سکتا اس لئے ہر شعبہ کے مختلف قائد ہوں اور ان قائدین میں سے جو سب سے زیادہ قوی ہو۔ وہی قائدِ اوّل ہو اور قائدِ دوم قائدِ اوّل کی رہنمائی کرے گا۔[1]

آپ کے خیال میں رئیس الاوّل ایسا ہونا چاہیے جسے دوسروں سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہ ہو اور اس میں مشاہدہ و تبلیغ کی قوت ہوا اور مملکت کے تمام امور پر کنٹرول رکھنے کا ملکہ ہو۔[2]

فارابی نے مندرجہ ذیل بارہ صفت اقتدارِ اعلیٰ کے لئے ضروری قرار دی ہیں۔

☆ جسمانی لحاظ سے بے عیب ہو اور اس میں کسی قسم کا نقص نہ ہو۔

☆ ذکی اور عاقل ہو۔

☆ قوتِ بیانیہ اس قدر ہو کہ جو کچھ کہے اُس کا نقشہ سننے والوں کے سامنے کھنچ جائے۔

☆ کم سے کم بحث مباحثہ سے چیزوں کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

☆ قوی حافظہ کا مالک ہو۔

☆ لہو ولعب سے متنفر ہو۔

☆ خواہشات نفسانی پر مکمل قابو رکھتا ہو بالخصوص کھانے پینے اور جنسی تعلقات کو حد سے آگے نہ بڑھنے دے۔

☆ سچ سے محبت کرتا ہو اور جھوٹ سے پرہیز کرتا ہو۔

☆ وسیع القلب ہو اور اس کو عدل وانصاف سے خصوصی لگاؤ ہو اور ظلم و تشدد کے پاس بھی نہ پھٹکے۔

☆ جس چیز کو بہتر سمجھتا ہو اِسے بلاخوف تردید نافذ کر سکے۔

☆ اس کا خزانہ معمور ہو اور وہ کافی دولت کا مالک ہو۔[3]

ماوردی:

ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی عراق کے ملک میں 974ء میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم سے فراغت پانے کے بعد کوفہ وبغداد میں معلمی کے فرائض انجام دیئے مگر اس کام کو زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکے کیونکہ نیشاپور میں قاضی کا عہدہ سنبھالنا پڑا۔ آخر عمر میں بغداد میں مقیم ہوئے۔ماوردی کے تعلقات آغاز میں آلِ بویہ سے خوشگوار تھے لیکن جونہی فرمانروا جلال الدولہ نے خلیفہ سے ملک الملوک کا خطاب دینے کی درخواست کی تو ماوردی نے اس کی شدید مخالفت کی اور فتویٰ دیا کہ باری تعالیٰ کے سوا اس خطاب کا کوئی مستحق نہیں ہے۔ اس واقعہ کے بعد آلِ بویہ آپ کے مخالف ہو گئے۔

1۔ ایضاً

Ibid

2۔ مولانا، غازی حامد انصاری، اسلام کا نظامِ حکومت، لاہور، 1999ء، ص:166

Molāna,Ghāzi Hamid Ansāri, Islam ka Nazam-e-Hakoomat, Lahore,1999,p 166

3۔ عبد السلام ندوی، حکمائے اسلام، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2018ء، ص:151

Abd-ul-salam Nadvi, Hukmā-i-Islam, National Book Foundation, Islamabad, 2018,p 151

ماوردی نے متعدد علوم پر کتب تحریر کیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام، سیاست غرض یہ کہ اپنے دور کے مروجہ علوم سے شاید ہی کوئی ایسا علم ہو جس پر ماوردی کی کوئی تصنیف نہ ہو۔ آپ کی درج ذیل تصانیف نے بہت شہرت حاصل کی۔

1۔ کتاب الاحکام السلطانیہ

2۔ تفسیر القرآن

3۔ کتاب الحادی الکبیر فی الفروع

4۔ نصیحۃ الملوک

5۔ قوانین الوزارت۔[1]

ماوردی نے اگرچہ مختلف علوم پر کتب لکھیں مگر سیاسیات میں اسے جو شہرت حاصل ہوئی وہ کسی اور میدان میں نہیں مل سکی۔ خاص طور پر آپ کی کتب "الاحکام السلطانیہ "۔

ہزار سال گزر جانے کے باوجود لاجواب ہے، یہ کتاب بیس ابواب پر منقسم ہے جس میں ہر پہلو پر بات کی گئی ہے۔ خلافت، وزارت، ولایت، مزاج، سپہ سالاری، پولیس، قضا، امامت الصلوٰۃ، ملکی تقسیم، اراضیات غرض کوئی ایسا موضوع نہیں جس کا ماوردی نے جائزہ نہ لیا ہو اور زریں اصول متعین نہ کئے ہوں۔ الاحکام السلطانیہ کے علاوہ سیاسیات پر قوانین الوازارت، تسہیل النظر فی تحصیل الظفر اور نصیحۃ الملوک بھی قابلِ فخر کتب ہیں۔

ماوردی کا طرزِ استدلال اسلامی ہے۔ وہ قرآن اور حدیث کو سرچشمۂ ہدایت سمجھتا ہے۔ اپنے خیالات کی توضیح و تائید حتی الامکان قرآن و حدیث سے کرتا ہے۔ مثلاً اس امر کی وضاحت کے لئے کہ فرمانروا کو عیش و عشرت کی زندگی سے پرہیز کرنا چاہیے وہ ان آیات کو پیش کرتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو تفویض خلافت کے وقت ہدایات دی تھیں۔ اگر کسی مسئلے کے متعلق قرآن خاموش ہو جائے تو احادیث سے استنباط کرتا ہے۔ مثلاً امام کو جانشین مقرر کرنے کے ثبوت میں جنگِ موتہ کا واقعہ نقل کیا ہے جس میں آپ ﷺ نے یکے بعد دیگرے تین سپہ سالار مقرر فرمائے۔ ماوردی کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے اقوال وافعال بھی مستند ذریعہ استنباط ہیں اور تابعین اور تبع تابعین کے طرزِ عمل سے بھی سیاسی احکامات کا استنباط کیا ہے، خلافت کے عہدے کی اہمیت کا اظہار حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے خطبے سے کیا ہے۔ کہیں کہیں نامور مسلم فرمانرواؤں سے بھی سیاسیات کے اصول متعین کئے ہیں۔[2]

ماوردی نے اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ " کی ابتداء "نظریہ امامت " سے کی ہے۔ ماوردی نے خلافت کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام اور قوانین لوگوں تک پہنچا دیئے ہیں۔ تاکہ ان کی رو سے مقدمات کا تصفیہ کیا جاسکے اور باہمی خصوصیات کا فیصلہ ہو۔ نیز اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظم و نسق مختلف حکومتوں کے سپرد کر رکھا ہے تاکہ دنیا کا نظام درہم برہم نہ ہونے پائے۔

[1]۔ وثیق احمد، پروفیسر، مشرق ومغرب کے سیاسی افکار، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، 2000ء، ص:162

Waseeq Ahmad, Professor, Mashriq o Maghrib ky Syāsi Afkār, Shiekh Muhammad Bashir And Sons, 2000, p 162

[2] Hamid A. K Rai, History of Political Philosophy, Aziz Publishers Urdu Bazar Lahore,1981,P: 660۔

حامد اے۔ کے رائے، ہسٹری آف پولیٹیکل فلاسفی، عزیز پبلشرز، اردو بازار لاہور، 1981، ص:660

ماوردی کی رائے میں "امامت وہ بنیاد ہے جس پر قانون واحکام کی عظیم عمارت کھڑی ہے۔" اس لئے اس کے نزدیک امامت کے دو مقاصد ہیں۔ اوّل یہ کہ حق وانصاف کا دنیا میں بول بالا ہو اور دوم نیک وبد، خیر وشر اور ماموالات ومنہیات میں تفریق کرے۔[1]

امامت کی ضرورت کو ثابت کرتے ہوئے ماوردی کہتا ہے کہ امامت عقلاً ضروری ہے کیونکہ تمام دانا سمجھدار آدمی اپنے معاملات ایک قائد کے سپرد کر دیتے ہیں تا کہ وہ ان کو ذلت وتوہین سے بچائے اور باہمی نزاع کی صورت میں بے لاگ فیصلہ کرے۔ وصالِ رسول اللہ ﷺ کے بعد فوراً ہی مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا ہوا وہ اس بات پر تھا کہ جانشین رسول ایک خاندان سے خاص ہو یا کسی بھی خاندان سے ہو، صحابہ کرامؓ ثقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور بات چیت کے بعد جمہور خلیفہ کے قریش ہونے پر متفق ہوئے۔ ماوردی نے اپنی کتاب میں "الآیمۃ من القریش" کے نزاع کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مختلف ادوار میں مختلف گروہوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے مگر خود بھی "خلیفہ کے قریشی ہونے کے حامی ہیں۔"

ماوردی کا خیال ہے کہ امام پوری قوم کے مشورے سے چنا جانا چاہیے لیکن ہر کس وناکس کو رائے دینے کی اجازت نہیں دیتا۔

ماوردی نے امام کے اوصاف پر بھی روشنی ڈالی ہے:

- ☆ بالغ اور آزاد ہونا ضروری ہے۔
- ☆ کردار کا بہت بلند ہو۔
- ☆ عدالت، سخاوت، شجاعت، اولوالعزمی اور ثابت قدمی کا مالک ہو۔
- ☆ حواس واعضاء صحیح سلامت ہوں۔
- ☆ اتنا علم ہو کہ اجتہاد کر سکے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مقامات کا فیصلہ کر سکے۔
- ☆ نسبتاً قریشی ہونا ضروری ہے۔
- ☆ اصابت رائے اس حد تک ہو کہ موقع ومحل کے لحاظ سے کام کرے۔
- ☆ لوگوں سے مشورہ کرے لیکن ان مشوروں کو اپنے عقل کے ترازو پر تولے۔[2]

نظام الملک طوسی:

نظام الملک کا نام حسن اور کنیت ابو علی ہے۔ 408ھ طوس کے ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ زندگی کے ابتدائی ایام میں ہی ماں کا سایہ سر اُٹھ گیا اور باپ نے نامساعد حالات میں بھی بچے کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ سات برس کی عمر میں ہی آپ نے پورا قرآن حفظ کر لیا اور عربی زبان کے علاوہ دیگر مذہبی امور میں بھی مہارت حاصل کی۔ آپ کو ریاضی میں خاص دلچسپی تھی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد متعدد حکومتوں میں معمولی عہدوں پر فائز رہا۔ اپنے علم وفضل اور ذہانت کی وجہ سے سلجوق کے بیٹے الپ ارسلان نے آپ کو اپنا کاتب مقرر کر لیا۔ طغرل کے انتقال کے بعد جب الپ ارسلان بادشاہ ہوا تو اس نے نظام الملک کو اپنا وزیر مقرر کر لیا اور سارے امور مملکت آپ کے سپرد کر دیے۔ الپ ارسلان کے دس سالہ دورِ حکومت میں آپ ملک کے سیاہ سفید کے مالک رہے۔

---

[1] ۔ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:76

Rasheed Ahmad, Musalmano ky Syāsi Afkār, p 76

[2] ۔ الماوردی، علی بن محمد بن حبیب ابو الحسن، احکام السلطانیہ، مطبعۃ الحلبی، قاہرہ، 1386ھ، ص:28

Al-Māvardi , Ali bin Muhammad bin Habeeb Abu-al-Hassan, Ahkām-i-Sultānia, Matbāt-ul-Halbi,Qahira,1386,p 28

الپ ارسلان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ بادشاہ ہوا اور نظام الملک کو اس نے اتابک اور عماد الدولہ کے القاب عطا کر کے اپنی وسیع و عریض سلطنت کا مختارِ کل بنا دیا۔ نظام الملک نے تمام مخالفین کو زیر کیا اور تہذیب و ثقافت، خوشحالی اور فارغ البالی کے لحاظ سے ریاست نے ممتاز درجہ آپ ہی کے حسنِ سیاست کی بدولت آپ کو ملنے والے خطابات سے لگایا جاسکتا ہے۔ چند اہم خطابات میں وزیرِ کبیر، خواجہ بزرگ، مؤید الدین، مستحدم للسیف والقلم اہم ہیں۔[1]

ملک شاہ کے وزیر کی حیثیت سے نظام الملک نے بیس سال تک کے خدمات انجام دیں، ملوکیت میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک شخص کی چشم خشم آلود بڑے سے بڑے آدمی کا کام تمام کر دیتی ہے۔ یہی سب نظام الملک کے ساتھ ہوا۔ اس کے اختیار واقتدار کو دیکھ کر حاسدین گھات میں تھے۔ ملک شاہ کی بیوی ترکان خاتون اپنے کم سن بیٹے کو نامزد کرنا چاہتی تھی۔ نظام الملک جیسا مدبر اس پر حکم صادر کیسے کر سکتا تھا۔ اس تمام کش مکش کا نتیجہ نظام الملک کی معزولی کی صورت میں نکلا۔ معزولی کے چند ماہ بعد اسے قتل بھی کروا دیا گیا، آپ نے 77سال کی عمر پائی۔

دو ہی کتابیں نظام کے نام سے منصوب کی جاتی ہیں۔ ایک سیر الملکوک جو سیاست نامہ کے نام سے مشہور ہے۔ دوسری دستور الوزراء۔ سیاست نامہ کتاب نظام نے بادشاہ کے کہنے پر لکھی جس میں ان سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں کہ اصولِ جہاں داری کیاہیں؟ موجودہ نظامِ حکومت میں کون سی بدعتیں ہیں اور کیا کیا خامیاں ہیں؟ اگلے زمانے کے کون سے اصول ہیں جو اب ترک کر دیئے گئے ہیں۔ بادشاہ نے اس کتاب کو اتنا پسند کیا کہ اپنی حکومت کا دستور قرار دیا۔ نظام نے بعد میں گیارہ ابواب کا اضافہ کر کے ان اصولوں کی وضاحت بھی کی۔[2]

سیاست نامہ میں سیاسیات کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے۔ بادشاہ کے اوصاف و فرائض کا تفصیلی ذکر ہے۔ وزراء اور ان کے عہدے داروں کے اوصاف و فرائض بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔

فارسی ادب و تنقید کے ماہر "براؤن" کا قول ہے کہ:

"میرے خیال میں سیاست نامہ فارسی نثر کی سب سے زیادہ قیمتی اور دلچسپ کتابوں میں سے ایک ہے۔ اوّل اس لئے کہ اس میں تاریخی واقعات کا نادر ذخیرہ جمع کر دیا گیاہے۔ دوم اس لئے کہ کتاب کے ذریعے حکومت کے متعلق سب سے بڑے وزیر کے خیال تک رسائی حاصل ہوئی ہے۔ جس کی قوت و فراست کا اندازہ لگانے کے لئے یہ جان لینا کافی ہے کہ اس کے مرتے ہی فتنہ وفساد کا دروازہ کھل گیا۔"[3]

---

[1]۔ Leiden & E.J. Brill, The Encyclopedia of Islam,1960,3/931

لیڈن اینڈ ای۔ جی۔ بریل، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، 1960، 3/931

[2]۔ The Encyclopedia of Islam,3/932

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، 3/932

[3]۔ E.G.Browne, Literary History of Persia, Cambridge University Press,1956,P. 148

ای۔ جی۔ براؤن، لیٹریری ہسٹری آف پرشیا، کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1956، ص۔ 148

نظام الملک سیاسی مفکر کی حیثیت سے وہ مقام رکھتا ہے جہاں تک متقدمین اور متاخرین میں سے کوئی نہ پہنچ سکا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ سیاسی اور تنظیمی گتھیوں کو سلجھانے میں بسر ہوا اس لئے وہ عملی سیاست میں جو مہارت رکھتا تھا دیگر فلسفیوں کے حصے میں اس کا عشر عشیر بھی نہ آیا، یہی وجہ ہے کہ وہ سیاسیات کے متعلق جب لب کشائی کرتا ہے تو سنی سنائی نہیں کہتا یا کوئی ایسی بات نہیں کرتا جو قابل عمل نہ ہو بلکہ سیاست نامہ اس کی تیس سالہ عملی سیاست کا نچوڑ ہے۔

نظام الملک کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دور میں اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرلیتا ہے اور نظم ونسق اور مخلوق کی فلاح وبہبود کا کام اس کے سپرد کر دیتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اس شخص کا رعب ڈال دیتا ہے تاکہ لوگ اس کے عدل کے سائے میں امن وامان کی زندگی گزار سکیں، اس طرح نظام الملک کے مطابق "بادشاہ مامور من اللہ ہوتا ہے۔" اسی لئے بادشاہ عوام کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔ اس کے خیال میں اگر رعایا شریعت پر خلوص سے عمل پیرا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ ان پر عادل حکمران مقرر نہ کرے۔ ظالم بادشاہ اللہ کی ناراضی کی علامت ہے جو رعایا کے بداعمالیوں کا نتیجہ ہے، بادشاہ اور عوام کے تعلق میں وہ بادشاہ کو مطلق العنان سمجھتا ہے مگر ساتھ ہی بادشاہ پر اتنی پابندیاں لگا دیتا ہے کہ مطلق العنانی کا نام ونشان باقی نہیں رہتا۔ قیامِ عدل میں آقا وغلام کی تمیز نہیں رہتی۔ عدل کی اہمیت وہ قرآن وحدیث سے واضح کرتا ہے۔ مسلم وغیر مسلم اقوام کی تاریخ سے مثالیں دیتا ہے۔ اولیاء کرام کے اقوال سے سند لاتا ہے اور بادشاہ کو بار بار یاد دلاتا ہے کہ اگر وہ رعایا کے ساتھ برابر تاؤ کرے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے روبرو جواب دہ ہونا پڑے گا۔

نظام الملک نے بادشاہ کے اوصاف کی ایک فہرست بھی دی ہے:

- ☆ آپ پہلے مفکر ہیں جو بادشاہ میں حسنِ صورت کو ایک ضروری صفت قرار دیتے ہیں ورنہ پہلے کے فلسفی اعضاء کو حواس ہی کو ضروری سمجھتے تھے۔
- ☆ نظم الملک حسن سیرت پر بھی زور دیتا ہے اور حکمرانی کرنے میں جذبہ شجاعت، انصاف وبلند حوصلگی اور مجاہدانہ روح کو لازمی عنصر قرار دیتا ہے۔
- ☆ وہ بادشاہ کو نظری اور عملی دونوں لحاظ سے مذہب کا ایک جامع نمونہ سمجھتا ہے، اس لئے اس کے نزدیک جہاں بادشاہ کو راسخ العقیدہ اور قوی الایمان ہونا ضروری ہے وہیں شرعی احکامات پر عمل بھی لازم ہے، اس کا کہنا ہے کہ بادشاہ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو، خیر وزکوٰۃ کا عادی اور دل کا سخی ہو۔
- ☆ نظام الملک بادشاہ کے لئے عالم وفاضل کی شرط نہیں لگاتا بلکہ صرف یہ ضروری خیال کرتا ہے کہ بادشاہ میں علوم وفنون کا ذوق موجود ہو اور علماء فضلاء کا امتزاج کرے۔ اُن سے قرآنی وفقہی تعلیمات سنے تاکہ ان کی روشنی میں نظامِ مملکت چلا سکے۔[1]

امام غزالی:

امام غزالی کا نام محمد، کنیت ابو حامد اور خطاب حجۃ الاسلام ہے۔ آپ 450ھ میں طوس کے مقام طاہران میں پیدا ہوئے۔[2]

---

[1] ۔ نظام الملک طوسی، خواجہ، سیاست نامہ (مترجم شاہ حسن عطاء)، نفیس اکیڈمی، کراچی، 1976ء، ص:138

Nizām Al Malik Tousi, Khawaja, Siyāsat Nāma (Mutarjim Shah Hassan Atāa), Nafees Acadmy, karachi, 1976,p 138

[2] ۔ شبلی نعمانی، علامہ، الغزالی، اسلامی کتب خانہ، لاہور، س ن، ص:8

Shibli Naumāni,Alāma, Al Ghazāli, Islāmi Kutab Khana, Lahore,p 8

آپ نے ابتدائی تعلیم طوس ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد نیشاپور گئے اور امام الحرمین جیسے اساتذہ سے کسبِ فیض کیا۔
آپ نے نظام الملک تک رسائی حاصل کی اور مدرسہ نظامیہ میں معلم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر 23 برس تھی۔ دارالخلافہ میں قیام کے دوران غزالی اپنے علم وفضل کی وجہ سے ارکانِ سلطنت ہمسر ہوگئے حتیٰ کہ سلطنت کے اہم امور میں آپ کے مشورے لئے جاتے۔ آپ نے بغداد میں چار سال قیام کیا۔ آپ نے نہایت پر شکوہ زندگی گزاری مگر 28 سال کی عمر میں تارک الدنیا ہوگئے اور دو سال دمشق میں قیام رہا پھر بیت المقدس جانکلے اور پھر عازمین حرمین میں شامل ہوئے۔ مگر جلد ہی اہل وعیال کے پاس واپس طوس آگئے اور گھر کے ساتھ ہی ایک مدرسہ قائم کیا جہاں تعلیم وتدریس کا سلسلہ آخری دم تک جاری رکھا۔[1]

آپ نے 55 سال کی عمر پائی اور تمام علوم دینیہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، علم الکلام، تعلیم اور وعظ ومناظر میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ ہم عصروں میں بھی سبقت لے گئے۔ آپ نے 50 سے زائد کتابیں لکھیں، "**یاقوت التاوین فی تفسیر التنزیل**" لکھی جو تفسیر کے موضوع پر 40 جلدوں کی حامل کتاب ہے۔ آپ نے تصانیف میں عربی اور فارسی زبانوں کا استعمال کیا۔

سیاسیات کے موضوع پر غزالی کی اہم ترین کتاب "**المنقدمن الضلال**" ہے۔ سیاسیات کے بارے آپ لکھتے ہیں کہ یہ علم آسمانی کتابوں سے حاصل ہوتا ہے جو رسولوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچتی ہیں یا سلف صالحین کے احکام واقوال سے علمِ سیاسیات کے اصول ماخوذ ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے "احیاء العلوم نامی کتاب بھی تحریر کی۔ اس کتاب میں جابجا آپ کے سیاسی نظریات ملتے ہیں جن میں مملکت کی ابتداء، بادشاہ کی ضرورت اور معاشی مسائل شامل ہیں۔ آپ کی ایک اور تصنیف "**تبرك المسبوك**" ہے جو سیاسیات واخلاقیات پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں حکمرانوں کے لئے زریں مشورے تحریر کئے گئے ہیں۔ ان مشوروں سے غزالی کے سیاسی نظریات کی وضاحت ہوتی ہے۔ "کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد" بھی اگرچہ بنیادی طور پر عقائد کی کتاب ہے مگر اس میں بھی جابجا سیاسی اصول بیان کئے گئے ہیں۔ بالخصوص سلطان کی عزت واحترام پر بہت زور دیا گیا ہے۔[2]

غزالی مسلم مفکرین میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے سیاسیات کی اہمیت پر بات کی ہے وہ جملہ علوم کی صف میں سیاسیات کو اہم مقام دیتے ہیں۔ امام صاحب کے نزدیک سیاسیات ایک دینی علم ہے اور بہت اہم ہے اُنہوں نے سیاسیات کی تعریف بھی کی ہے کہ:

"وہ علم جو مملکت کے نظم ونسق کے مذہبی اور روحانی امور سے بحث کرتا ہے۔"[3]

آپ اصول سیاست کا ماخذ بھی کتب الٰہیہ اور بزرگوں کے احکامات قرار دیتے ہیں۔

آپ کے نزدیک انسانی زندگی کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں۔ غذا، لباس، مکان اور باہمی تعلق۔ ان چاروں کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ غذا کے لئے زراعت، لباس کے لئے توربانی اور مکان کے لئے علم تعمیر اور "باہمی تعلقات کے لئے سیاسیات ضروری ہے۔" ان چاروں میں بھی وہ سیاست کو اہم ترین فن کہتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک سیاست پر ہی باہمی تعلقات اور خوشگوار زندگی

---

[1] ۔ تاج الدین السبکی، ابو نصر، طبقات۔ الشافعیہ، فیصل عیسی البابي الحلبي، 1964ء، 4/102
Tāj_ ud_ din Al-Subki,Abu Nasar, Tabqat Al_ Shafiya, Faisal Eesa Al_Bābi Al_Halbi, 1964, 4/ 102

[2] ۔ Reynold A Nicolson,A Literary History of the Arabs,Charles Scribner's Son, New York,1907, p.128
رینولڈ اے نیکولسن، لیٹریری ہسٹری آف عرب، چارلس سکریبنز سنز، نیویورک، 1907، ص 128

[3] ۔ الغزالی، ابو حامد، الاقتصاد فی الاعتقاد، الجامع الکبیر لکتب التراث العربي والإسلامي، 2016ء، ص: 101
Al_Ghazāli, Abu Hāmid, Al_Iqtasād Fi Al_aitqād, Al_Jāmi Al_Kabir Al_kutab Al_ Tarās Al_ Arbi wa Al_ Islāmi, 2016, p 101

کا دارومدار ہے۔اس لئے وہ ماہرِ سیاست کے لئے اعلیٰ اوصاف سے متصف ہونے کی شرط لگاتے ہیں۔ان کا دعویٰ ہے کہ سیاست دان اپنی انہی صفات کے باعث دوسروں سے خدمت لیتا ہے اور سب کو اپنا تابع اور مطیع سمجھتا ہے۔[1]

غزالی نے سیاست کے چار مراتب بتائے ہیں۔اعلیٰ ترین مرتبہ سیاست انبیاء کرامؑ کی سیاست کو حاصل ہے کیونکہ ان کے اوامر ونواہی خاص وعوام پر ایک کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور ظاہر وباطن پر حال میں واجب التعمیل دیں، دوسرا مرتبہ خلفاء، ملوک وسلاطین کی سیاست کا ہے ان کے احکام بھی خاص وعام پر حاوی ہوتے ہیں، مگر صرف ظاہر پر باطن ان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔تیسرا مرتبہ علماء کا ہے جن کی سیاست عوام کے باطن پر حاوی ہوتی ہے اور چوتھا مرتبہ واعظین کی سیاست کا ہے۔یہ بھی عوام کے باطن پر اثر کرتے ہیں اس طرح "غزالی کے نزدیک ملوک وسلاطین کا مرتبہ انبیاء کے بعد اور علماء وواعظین سے پہلے سے ہے۔"[2]

غزالی اقتدارِ اعلیٰ کے بارے میں واضح نظریہ رکھتے تھے۔اقتدارِ اعلیٰ کی ضرورت کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ:

"اجتماع کو نزاع سے محفوظ رکھنے اور بنی نوع انسان کو باہمی کشت وخون سے بچانے کے لئے بہت سے فنون کے علاوہ بہت سے ایسے لائق اور قابلِ افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو ان فنون میں مہارت رکھتے ہوں۔انہیں لائق اور قابل لوگوں کے انتخاب اور تقرر کے لئے ایک فرد کی ضرورت ہے جو امام یا خلیفہ ہوتا ہے۔"[3]

غزالی نے امامت کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ امام زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے وہ امامت کے وجوب میں قرآن وسنت کے علاوہ عقلی دلائل بھی دیتے ہیں۔ آپ کے خیال میں نظامِ دین کا دارومدار نظامِ دنیا پر ہے اور نظامِ دنیا امام کے بغیر محال ہے۔اس طرح آپ حسن وسیاست کے ملاپ کے قائل ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ اگرچہ مقصود بالذات دین ہی ہے لیکن حصولِ دین کا ذریعہ حکومت وسیاست ہے اور بغیر حکومت کے سعادتِ اُخروی کا تصور ہی محال ہے۔

امام کے بارے میں غزالی کی مختلف تصنیفات میں درج ذیل اوصاف ملتے ہیں:

- ☆ خلیفہ اور امام مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور امامت مسلمانوں کے اتحاد کی نشانی ہے۔
- ☆ ماوردی نے خلافت کے لئے ضروری خیال کیا ہے کہ وہ جہاد کی صفت سے متصف ہو لیکن غزالی اپنے زمانے کے حالات کے باعث اس صفت کو ضروری خیال نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ دربار میں کوئی شخص اِن اوصاف سے متصف ہو تو خلیفہ کا کمزور ہونا بھی ضرر رساں نہیں۔
- ☆ ماوردی امام میں اصابتِ رائے کو ضروری قرار دیتے ہیں مگر غزالی کے خیال میں خلیفہ کو ماہر اور فرض شناس وزراء دستیاب ہو سکتے ہیں جو نظم ونسق مملکت کو وزراء کی طرف سے چلا سکتے ہیں۔

---

1 ۔ شبلی نعمانی، الغزالی، ص:20

Shibli Naumāni, Al_ Ghazāli, p 20

2 ۔ غزالی، محمد بن احمد طوسی، امام، نصیحۃ الملوک، کتاب خانہ طھران، 1315ھ، ص:604

Ghazāli, Muhammad bin Ahmad Tousi, Imam, Nasihat-al-Malook,kitaab khāna Tehrān,1315,p 604

3 ۔ غزالی، محمد بن احمد طوسی، امام، نصیحۃ الملوک، ص:604

Ghazāli, Muhammad bin Ahmad Tousi, Imam, Nasihat-al-Malook,p 604

☆ غزالی کے پیشِ نظر مستنظہر باللہ تھا جو علم و فن کا قدر دان تھا اور علماء و فضلاء کا سرپرست تھا تاہم اجتہاد کے درجے تک علم نہیں رکھتا تھا۔ غزالی اجتہاد کو بھی خلیفہ کے لئے بدی خیال نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب شجاعت و قوت میں سلطان پر خلیفہ اعتماد کر سکتا ہے تو دینی مسائل کے لئے وہ علماء سے مدد کیوں نہ لے۔ اس لئے غزالی علماء سے مشورہ لینے اور ان سے ہدایت حاصل کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ تاہم وہ خلیفہ کو علوم شرعی کا علم حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ تاکہ شرع کے مطابق زندگی بسر کرے اور اس کی روشنی میں امورِ مملکت چلا سکے۔

☆ غزالی نے خلیفہ میں ایک صفت کو لازم قرار دیا وہ "ورع" ہے یعنی خوفِ خدا۔

☆ آپ نے خلیفہ کا عاقل ہونا ضروری خیال کیا ہے۔

☆ چیزوں کے صحیح ادراک، دوراندیشی اور حالاتِ حاضرہ کی مکمل واقفیت کے ساتھ ساتھ تاریخ و قدیم بادشاہوں کا علم بھی امام کے لئے ضروری ہے۔

☆ آپ کے خیال میں حکمران کو رعایا کے ساتھ بے پناہ محبت ہونی چاہیے۔[1]

آپ خلیفہ کو اس بات کا حق دیتے ہیں کہ وہ اپنے اختیارات ایسے لوگوں کو تفویض کرے جو فی الحقیقت شوکت و قوت کے مالک ہوں لیکن لوگوں کے معاش و محاذ کی مکمل ذمہ داری خلیفہ پر رہی ہے نہ کہ اس شخص پر جس کے سپرد اختیارات کئے گئے ہوں۔

ابنِ تیمیہ:

زوالِ بغداد کے 5 سال بعد 10 ربیع الاوّل 661ھ کو حران میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام احمد، تقی الدین لقب اور ابولعباس کنیت ہے۔ آپ کی والدہ کا نام تیمیہ تھا جن کی عمیت کا شہرہ دور دور تک تھا۔ ان خاتون کی بدولت ہی اس خاندان نے علمیت میں شہرہ حاصل کیا۔

آپ کی پیدائش کے وقت فتنۂ تاتار عروج پر تھا۔ آپ کے خاندان کو حران چھوڑ کر دمشق آنا پڑا اور یہیں آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ گھر پر ہی قرآن مجید حفظ کیا اور صرف و نحو اور تاریخ و ادب کی کتب پڑھیں۔ آپ کو 11 سال کی طالب علمی کے بعد صرف 17 سال کی عمر میں فتویٰ دینے کا مجاز قرار دے دیا گیا، آپ کے علم و فیض کے پیشِ نظر 30 سال کی عمر میں قاضی القضاء کا عہدہ پیش کیا گیا مگر آپ نے قبول نہ کیا۔[2]

آپ نے کل 44 سال کی عمر پائی۔ آپ طویل مدت تک تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے قید خانہ میں رہے اور عملی جہاد میں بھی حصہ لیا۔ اس کے باوجود آپ کی تصانیف کی تعداد پانچ سو بتائی جاتی ہے۔ آپ کی تصانیف تقریباً تمام علوم متداولہ پر ہیں۔ جن میں تفسیر، حدیث، فقہ و اصول، فتاویٰ، ادب، نحو، لغت، منطق، ہیئت، ریاضی اور سیاسیات شامل ہیں، آپ کی سیاسی تصانیف میں درج ذیل کتب شامل ہیں۔

☆ الامامة ولاسیاسیة۔

☆ السیاسة الشرعیه فی اصلاح الراعی والرعایا۔[3]

---

[1] ۔ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص: 128۔130

Rasheed Ahmad,Musalmano ky syāsi Afkār,p 128-130

[2] ۔ یوسف کوکن عمری، امام ابن تیمیہ، ذوالنورین اکادمی سرگودھا، 1982ء، ص: 55

Yousuf kokan umrri, Imam Ibn-i-Tymiya, zun-nu-Ryn Acadmy Sargodha, 1982, p 55

[3] ۔ ضیاءالحسن فاروقی، فکرِ اسلام کی تشکیل جدید، مکتبہ رحمانیہ لاہور، 1978ء، ص: 314

Ziā al Hassan Farooqi, Fikr-i-Islam ki Tashkeel-i-jadeed, Maktaba Rehmāniya Lahore, 1978, p 314

ان کتب میں جہاں بانی کے اصول بتائے گئے ہیں۔ راعی و رعایا کے فرائض و تعلقات، شرعی حدود اور اسلامی سے متعلق تفاصیل بھی پیش کی گئی ہیں، آپ نے اپنے سیاسی نظریات کے اثبات میں صرف کتاب و سنت پر اکتفا کیا ہے البتہ کہیں کہیں آثار صحابہ اور ممتاز سلاطین اسلام کے طریقوں سے بھی استدلال کیا ہے، آپ قرآن کی آیات کے ذیل میں کھینچ تان کے قائل نہیں ہیں بلکہ لفظی معنی مراد لیتے ہیں، مثلاً وہ اپنی کتاب سیاستِ شرعیہ میں اس پر زور دیتے ہیں کہ حکمران کو چاہیے کہ وہ مستحق افراد کو عہدے دے۔

احادیث میں بھی ضعیف احادیث سے استناد نہیں کرتے بلکہ صحاح ستہ تک اپنے آپ کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آپ اپنے وقت کے اُن علماء میں سے تھے جنہیں دین اور سیاست کے درمیان ملاپ کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ آپ کے سیاسی تصورات کلیۃً قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے عصری ضروریات اور شریعت میں انتہائی خوبصورت مطابقت پیدا کی۔ آپ کے سیاسی افکار کا معمول یہ ہے کہ احکام شرعیۃ معاشرے کی اصلاح و تنظیم میں کس حد تک معاون ہیں لیکن وہ اس بحث سے پہلو تہی کر جاتے ہیں کہ عمر کا عصری سیاست اور دینی احکامات سے کیا تعلق ہے اور اسے دینی بنانے کے لئے کیا کیا تبدیلیاں بروئے کار لانی چاہئیں۔

آپ کے نزدیک دین اور سیاست لازم و ملزوم ہیں، ابنِ تیمیہ کی رائے میں سیاست کا حصہ تقرب الی اللہ اور اقامت دین ہے۔ آپ "سیاستِ شرعیہ" میں لکھتے ہیں کہ:

"ولایت و حکمرانی کا لازمی مقصد خلق خدا کے دین کی اصلاح ہے۔ اگر لوگوں کا دین برباد ہو جائے تو بے حد مہلک ہو گا۔"

دین حکومت کی حیثیت پناہی سے عاری ہو تو لوگوں کے احوال فاسد ہو جاتے ہیں۔"[1]

آپ اپنی کتب میں اجتماع کو ضروریات کی تکمیل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، کیونکہ اجتماع کے بغیر بنی آدم اپنی حاجتیں اور ضرورتیں پوری نہیں کر سکتے اس لئے ضروری ہے کہ اجتماع کی حالت میں اُن پر کوئی حاکم اور آمر ہو۔ آپ کے نزیک امور رعایا کا والی و نگران ہونا واجباتِ دین میں سب سے بڑا واجب ہے۔ اس وجوب کے دو اسباب بتاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حکام نہ ہو تو دین کا قیام و بہبود ممکن ہے نہ دنیا کی فلاح۔ دوسرا یہ کہ اللہ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو واجب قرار دیا ہے اور یہ فریضہ قوت امارت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔

ابنِ تیمیہ قرآن وسنت کی پاسداری حکمران کا اولین وصف قرار دیتے ہیں اور خود امام کے اوصاف کی کوئی فہرست فراہم نہیں کرتے، آپ کے خیال میں امام خواہ کسی بھی طریق سے برسرِ اقتدار آیا ہو، ظاہر اوصاف خواہ کیسے بھی ہوں لیکن دین اور دنیا کے فرائض کی تکمیل کماحقہ ضروری ہے۔

ابنِ تیمیہ ظالم حکام کے حقوق کی ادائیگی کا بھی رعایا کو حکم دیتے ہیں۔ آپ حاکم میں عدل و انصاف کی فراہمی کے وصف کو بدرجہ اتم دیکھنا چاہتے ہیں اور دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ:

إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّواْ ٱلْأَمَانَاتِ إِلَىٰٓ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ ٱلنَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِٱلْعَدْلِ إِنَّ ٱللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ سَمِيعاً بَصِيراً۔[2]

علاوہ ازیں ابنِ تیمیہ والیانِ حکومت کو مشورہ دیتے ہیں کہ ملک کے متعلقہ امور کی انجام دہی نصرت الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے حصول کے لئے اللہ پر بھروسہ کریں، رعایا کو نفع دیں اور احسان کریں۔

1۔ ابن تیمیہ، امام، السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، دار الکتب بیروت، س ن، ص:187

Ibn-i-Tymiya, Imām, Al siyāsat Al shriāya fi Islāh Al rāii wa Al raiyyat, Dar Al Kutab Bairoot,p 187

2۔ النساء،58:4

Surah Al Nisa:4:58

ابنِ خلدون:

ابنِ خلدون کی تاریخ ولادت یکم رمضان 732ھ مطابق 27 مئی 1332ء ہے ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق اپنے والد محمد سے حاصل کی پھر قرآن مجید حفظ کیا۔ حدیث وفقہ کے علاوہ عربی زبان وادب میں مہارت نامہ حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں والدین اس طاعون سے فوت ہوگئے جس نے افریقہ کے اکثر ممالک کو ویران کرکے رکھ دیا۔ اس کے بعد بھی ابنِ خلدون نے تین سال تک اپنی تعلیم جاری رکھی اور بیس سال کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہوگیا۔[1]

ابنِ خلدون نے سلطان ابواسحاق دوم کی ملازمت اختیار کرلی۔ شاہی فرامین واحکامات پر طغریٰ درج کرنے کاکام اس کے سپرد ہوا۔ یہ عہدہ "کتابت علامت" کہلاتا تھا۔ پھر ابن خلدون مراکش چلاگیا۔ جہاں وہ سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوا۔ بعدازاں پھر طیونس آگیا۔ طیونس کے بادشاہ نے اس کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا اس زمانے میں ابن خلدون نے سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ طیونسی علماء نے ابنِ خلدون کی موجودگی کو اپنے لئے خطرہ سمجھا۔ اس لئے اس کو جلاوطن کرنے کی غرض سے سازشیں شروع کردیں اور اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ابنِ خلدون کو طیونس چھوڑدینے ہی میں اپنی خیر دکھائی دی اور وہ بادشاہ سے حج کے بہانے سے اجازت لے کر قاہرہ پہنچا۔ اس وقت اس کی عمر 25 سال تھی۔ مصر میں بھی ابنِ خلدون کے حریفوں کی بڑی تعداد پیداہوگئی جس نے اسے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ وہ سات آٹھ مرتبہ قضاء کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔ لیکن ہر بار حاسدوں کی ریشہ دوانی اس کے عزل کاباعث بنی۔

ابنِ خلدون کی تصانیف کادائرہ نہایت وسیع ہے۔ فلسفہ ومنطق، فقہ وادب حتیٰ کہ ریاضی پر بھی اس نے کتابیں لکھیں۔ منطق پر ایک رسالہ لکھا۔ ابن رشد کی کتابوں کی تلخیص کی۔ لیکن ان کتابوں کے نام ہی مل سکتے ہیں کیونکہ یہ کتابیں زمانے کے ہاتھوں ضائع ہوگئیں۔[2] البتہ اس کی شہرہ آفاق تاریخ، تاریخ العبر موجود ہے۔ یہی کتاب ہے جس پر ابن خلدون کی شہرت کاانحصار ہے اس میں آفرینش عالم سے لے کر آٹھویں دیکے اختتام تک عرب بربر اور دیگر اقوام کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ تاریخ العبر سے پہلے ایک حصہ بطور مقدمہ لکھا گیاہے جو "مقدمہ ابن خلدون" کے نام سے چاردانگ عالم میں مشہور ہوا۔ اس مقدمہ میں مطالعۂ تاریخ کے اصول بتلائے گئے۔ اور تمدن ومعاشرت کی ترقی وزوال کے اسباب سے بحث کی گئی ہے۔ مقدمہ، ابنِ خلدون کے سیاسی افکار کابہترین ذخیرہ ہے۔

ابن خلدون دیگر مسلم مفکرین کی طرح (بجز فارابی کے) انسانی معاشرہ کو اقتضائے فطرتِ انسانی کا نتیجہ قرار دیتاہے۔ اوراسے "مجتمع" کے لفظ سے یاد کرتاہے۔ وہ ہابس کے برخلاف سلامتی اورامن کی ضرورت پر مجتمع کی بنیاد رکھتاہے۔ اس کا کہناہے کہ انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہواہے۔ اس کی ضروریاتِ زندگی کی نوعیت ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ تنہا اس کے حصول کے لیے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر پوری نہیں کرسکتاہے اور الگ تھلگ رہنے کے لئے لاکھ جتن کرے لیکن اس میں کامیابی ممکن نہیں۔

انسانی ضروریات کے علاوہ اجتماعِ انسانی کامحرک ابنِ خلدون کے نزدیک دفاع بھی ہے وہ کہتاہے کہ حیوانات اپنی مدافعت آپ کرسکتے ہیں قدرت نے ان کی جسمانی ساخت کچھ اس قسم کی رکھی ہے۔ کہ حملوں سے اپنی حفاظت کرسکتے ہیں۔ ان کی موٹی کھال، سینگ پنجے اور ناخن آلاتِ حرب کاکام دیتے ہیں۔ جب کہ انسان ان تمام چیزوں سے محروم ہے۔ اسے ان کے بدلے میں دوچیزیں عطاہوئی ہیں ایک ہاتھ اور دوسری عقل، ان دونوں کی مدد سے وہ آلات تیار کرتاہے محض آلات اسے حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا اس لئے وہ ایسے گروہ کامحتاج ہے جس کے ساتھ مل کر دفاع کرسکے۔

ابنِ خلدون کا یہ کہناہے کہ انسانی اجتماع ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کاوجود ناکمل ہے نیز خداوند تعالیٰ کی یہ مشیت ہے کہ روئے زمین کو بنی نوع انسان کے ذریعے آباد کرے۔

ابن خلدون صرف مجتمع کی ضرورت اوراس کے وجود کے اسباب سے بحث نہیں کرتا۔ بلکہ ان عوامل کا بھی ذکر کرتاہے جو مجتمع پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک جغرافیائی حالات سب سے زیادہ انسانی معاشرہ کو متاثر کرتے ہیں۔ ابنِ خلدون قدیم جغرافیہ دانوں کی طرح کرۂ ارض کو سات اقالیم میں

1۔ Hamid A.K. Rai, History of Political Philosophy , P.676

حامداے-کے رائے، ہسٹری آف پولیٹیکل فلاسفی، ص:660

2۔ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:201

Rasheed Ahmad,Musalmano ky syāsi Afkār,p:201

منقسم کرتا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ اقلیم اول و ہفتم بہت زیادہ سرد اور بے حد گرم ہونے کے باعث غیر آباد ہیں۔ اس لئے انسانی آبادی اور تمدن کا گہوارہ نہیں بن سکتے۔ البتہ اقلیم سوم و پنجم نسبتاً معتدل ہیں اور سب سے زیادہ معتدل اقلیم چہارم ہے۔ اسی لئے یہ اقلیم سب سے زیادہ آباد ہے اور علوم وفنون، تمدن وثقافت، صنعت و حرفت کا ہی گہوارہ ہے۔ ایک طرف قدرت نباتات کی فراوانی میں بے حد فیاض ہے تو دوسری طرف انبیائے کرام کا محیط بھی یہی خطہ ہے۔ ابنِ خلدون کا دعویٰ ہے کہ جنوب کے بے حد گرم اور شمال کے بے حد سرد خطوں میں ایک بھی پیغمبر مبعوث نہیں ہوا۔ یہ خطے تمدنی لحاظ سے بے حد پسماندہ اور اخلاقی اعتبار سے گھٹیا ہیں۔

ابنِ خلدون کا بھی خیال ہے کہ مسائل کی کمی وزیادتی بھی معاشرے پر بہت اثرانداز ہوتی ہے۔ وسائل زندگی کی کثرت انسانی جسم و دماغ پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ ایسے لوگوں میں ذہن کی صفائی و نفاست نہیں پائی جاتی۔ جہاں وسائل کم ہوں وہاں کے باشندوں کو زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ وہ محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ذہن میں نکھار اور اخلاق میں پاکیزگی ہوتی ہے۔ ابنِ خلدون اس کی توجیہہ یہ بیان کرتا ہے کہ کھانے پینے کی زیادتی فاسد رطوبت پیدا کرتی ہے یہ جسم و ذہن پر اثر ڈالتی ہے۔

ابنِ خلدون کہتا ہے کہ نظام کے اعتبار سے کوئی قبیلہ کتنا ہی سادہ کیوں نہ ہو لیکن اس میں بھی حکومت کے حصول کی قدرتی خواہش ہوتی ہے۔ اسی خواہش پر حکومتیں قائم ہوتی ہیں اور مجتمع وجود میں آتا ہے۔ یہی خواہش قبیلہ کا دفاع کرتی ہے اور اسے فتح اور جنگ پر آمادہ کرتی ہے۔ ابنِ خلدون اقبال کی اسی خواہش یا خاصہ کو عصبیت کا نام دیتا ہے۔[1]

ابنِ خلدون کا دعویٰ ہے کہ اہل بادیہ یعنی دیہات میں عصبیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ کیوں کہ اس کے ذریعے سے بدوی قبائل بیرونی حملوں سے اپنی مدافعت کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ شہری آبادی میں فتنہ و فساد روکنے کے احکام ہوتے ہیں۔ جو داخلی بدامنی سے مجتمع کو محفوظ رکھتے ہیں اور بیرونی حملوں کے لئے فوج ہوتی ہے۔ ابنِ خلدون کے نزدیک عصبیت نسب ورشتہ کے علاوہ دین کے ذریعے بھی حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ دینی عصبیت قبائلی و نسبی عصبیت کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ سیاست و تمدن میں زبردست تعلق ہے جس قدر عصبیت قوی ہوگی عیش کی زندگی بسر کرنے کی خواہش بھی اتنی ہی شدید ہوگی۔

خلافت کے بارے میں ابنِ خلدون کا کہنا ہے کہ خلیفہ اللہ کا نہیں بلکہ رسول کا نائب ہوا کرتا ہے۔ ابنِ خلدون ان لوگوں سے بھی اختلاف کرتا ہے کہ جو خلافت کو مطلوب بالسنات نہیں کہتے بلکہ اسے قیام اور نفاذ احکامات شرعیہ کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ انتخاب خلیفہ کے طریقہ پر ابنِ خلدون نے اظہارِ خیال کیا ہے وہ اس انتخاب میں عوام کو رائے دینے کا حق نہیں دیتا اس کا کہنا ہے کہ خلیفہ کے انتخاب میں صرف ارباب حل وعقد ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ عوام پر خلیفہ کے احکام کی پیروی فرض ہے۔ انہیں خلیفہ کے تقرر سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔

1۔ حلم 2۔ عدالت 3۔ کفایت 4۔ اعضاء و حواس کی سلامتی

ان خاص چار صفحات کے علاوہ ابنِ خلدون امام میں درج ذیل اوصاف دیکھنا چاہتا ہے:۔

☆ ماوردی کی طرح خلیفہ کے علم کا معیار اجتہاد و استنباط ہے اور آپ خلیفہ کے دامن کو تقلید سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔

☆ خلیفہ کا شجاع اور دلیر ہونا ضروری ہے تاکہ سرحد کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اقامت حدود پر قدرت رکھے۔ جنگ میں نہ صرف حصہ لے بلکہ فنونِ جنگ میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو۔

☆ سیاست کا ماہر ہو۔ سیاست دانوں کی بڑی سے بڑی چال کو سمجھتا ہو اور اس کا جواب دینا جانتا ہو۔

☆ سلامتی حواس و اعضاء کو بھی ابنِ خلدون ضروری وصف خیال کرتا ہے۔[2]

---

[1] ۔ ابنِ خلدون، مقدمہ کتاب العبر، نفیس اکیڈمی کراچی، 1980ء، ص:107

Ibn e Khuldoon,Muqadma Kitab- al-Ibar, Nafees Acadmy Karachi, 1980,p 107

[2] ۔ ابنِ خلدون، تاریخ ابنِ خلدون، 1/161

Ibn-e-Khuldoon, Tareekh Ibn-e-khuldoon, 161/1

شاہ ولی اللہ:

شاہ قطب الدین المعروف شاہ ولی اللہ 1703ء (مطابق 1114ھ) میں دلی کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو علم و فضل اور صداقت میں مثالی تھا۔ آپ کے والد بزرگوار شاہ عبد الرحیم معروف عالم تھے اور دلی میں مدرسہ رحیمیہ (جو انہوں نے خود قائم کیا تھا) میں درس دیتے تھے۔ جب شاہ ولی اللہ کی پیدائش ہوئی تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے خواب میں ان کے والد شاہ عبد الرحیم کو بشارت دی۔ اسی کے تحت آپ کا نام شاہ قطب الدین رکھا گیا۔ پانچ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد ہی سے ابتدائی تعلیم اور قرآن کا سبق لینا شروع کیا۔ سات سال کی عمر میں وہ حافظِ قرآن ہوگئے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ فلسفہ، منطق، حدیث، فقہ، ریاضی، ادب، طب اور کلام جیسے علوم حاصل کر چکے تھے۔ اسی سال انہوں نے اپنے والد کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ 17 برس کے ہوئے تو ان کے والد وفات پاگئے اور مدرسہ رحیمیہ کا چارج انہوں نے سنبھال لیا۔ آپ کا وصال چالیس سال کی عمر میں 1763ء (مطابق 1176ھ) میں ہوا۔

شاہ ولی اللہ نے بڑے پُر آشوب دور میں زندگی گزاری۔ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ پاک وہند کے مسلمانوں کو جب بھی مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور اسلام کے دشمنوں نے سر اُٹھایا اور بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد ہی نے کمر ہمت باندھی اور مسلمانوں کو عذاب سے بچایا ایک بار جب شہنشاہ اکبر نے دینِ الٰہی کا فتنہ اُٹھایا تو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اصلاح احوال کے لئے جہاد کیا اور دوسری بار اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد جب حکومت کا فرع ٹمٹمانے لگا، سکھوں اور مرہٹوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ ادھر انگریزوں اور فرانسیسیوں نے قدم جمائے۔ اس وقت بھی مسلمان ایرانی وتوعانی کے چکر میں ایک دوسرے کے خون میں ہاتھ رنگ رہے تھے۔ فرقہ پرستی عام تھی اور علماء مسلمانوں میں تفرقہ سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مناظرہ روزمرہ کا معمول تھا۔ اس انتہائی بحرانی دور میں فاروقی نسل ہی سے شاہ ولی اللہ میدانِ عمل میں اترے اور انہوں نے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا۔ علماء کے خلاف بلا امتیاز مذہب و فرقہ وجہاد کیا اور حالات پر قابو پالیا۔ علاوہ ازیں شاہ ولی اللہ نے خطۂ پاک وہند میں لاتعداد بحرانی کیفیات کا مشاہدہ کیا۔ اسی لئے مسلمانوں کے عقائد بری طرح مجروح ہو رہے تھے۔ آخرکار شاہ ولی اللہ حقیقتاً مسلمانوں کے لئے ایک نعمت بن کر آئے اور انہوں نے اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ آپ نے لاتعداد کتب لکھیں۔ آپ نے قرآن کریم کا فارسی ترجمہ "فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن" بھی کیا۔ وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے کلام اللہ کا ترجمہ دوسری زبان میں کیا۔ مگر کچھ مفاد پرست علماء کو ان کی یہ خدمت ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس لئے کہ بعض علماء چاہتے ہی نہ تھے کہ لوگ قرآن کریم اور شرع کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ کیونکر اس طرح علماء کی اجارہ داری ختم ہو سکتی تھی۔ اسی خدمت کے صلے میں شاہ ولی اللہ پر بار بار نہ حملے ہوئے۔ اس کے بعد آپؒ نے فوز الکبیر کے نام سے قرآن کریم کے اصول تفسیر قلم بند کئے۔ تصوف پر آپ نے سطعات، در الثمین، سمعات، القول الجمیل اور لمعات سپردِ قلم کیں۔ حجۃ اللہ البالغہ ان کی وہ مایۂ ناز تصنیف ہے جو آج تک مقبول عام ہے۔ یہ تصنیف سیاست پر ہے۔ اسی طرح سیاست کے موضوع پر ان کی دوسری تصنیف 'الخیر الکثیر' ہے۔ شرع وسیاست پر مخلوط کتاب البدور البالغۃ ہے۔ خلافت سے متعلق ان کی ایک زندۂ جاوید تصنیف ازالۃ الخفاء عن خلافۃ ہے۔[1]

شاہ ولی اللہ کے مطابق معاشرے اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ جونہی اجتماع ہوتا ہے۔ یعنی معاشرہ وجود میں آتا ہے اس کے ساتھ ہی حکومت بھی نمودار ہو جاتی ہے۔ جس رفتار سے معاشرے کا ارتقاء ہوتا ہے۔ اسی رفتار سے سیاسی نظام میں ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ابتدائے حکومت میں تو ایک "سردار" قسم کے شخص کی ضرورت ہوتی ہے

[1] ۔ صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی مشرق ومغرب، ص:546

Salāh-ud-din Nāsik,Afkār e Siyāsi Mashriq o Maghrib,p:546

جو لوگوں کی ضروریات کے لئے سامان فراہم کرے اور کمزور کو تحفظ دے سکے۔ انسان کی نسل کی بقاء کے لئے ہر مرد کے لئے ایک عورت مخصوص کرے۔ شاہ ولی اللہؒ کے مطابق اسی "سردار" میں حوصلہ، قلبی قوت اور قوت فیصلہ کا ہونا ضروری ہے۔ نیز اس کا اپنا عمل ایسا ہو کہ دوسرے اس کی پیروی کر سکیں۔

اس کے بعد مملکت کا قیام عمل میں آتا ہے یعنی مدینہ، مدینہ کا مطلب شہر یا قلعہ نہیں لیتے بلکہ اسے اجتماع کا نام دیتے ہیں ان کے خیال میں دراصل مدینہ ہی انسانی جماعتوں کا نام ہے۔ مدینہ کی تعریف کے بعد شاہ ولی اللہ نے سیاست کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ علم جو اجتماع کے باہمی رابطہ یا تعلق کو مخلوط رکھنے کا طریقہ بتلاتا ہے۔ اور چونکہ شہر مختلف جماعتوں سے مرکب ہوتا ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ تمام اجزا اور افراد اپنے باہمی تعلقات میں عدل و انصاف کو پیشِ نظر رکھیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ قیامِ امن کے سلسلے میں ان میں سے کسی خاص منصب کے امتیازات حاصل نہ ہوں۔ اس لئے شہری نظم کی درستی کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کوئی شخص ایسا ہو جس کی نظام اطاعت پر اربابِ حل وعقد نے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ اجتماع میں ایک بڑی تعداد اس کے قیامِ نظم میں معاون و مددگار ہو۔ یہی شخص سلطان ہوتا ہے۔[1]

شاہ صاحب نے سلطان کے اوصاف تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

1۔ سلطان بلند اخلاق ہو جس میں نرمی کا ہونا غالب ہو اور وہ احسانات کے ذریعے عوام کو اپنا گرویدہ بنا سکے کیوں کہ احسانات محبت پیدا کرتے ہیں اور محبت کی زنجیریں لوہے کی بیڑیوں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ اس لئے بادشاہ اپنے عالی اخلاق، کریمانہ اوصاف، عام ہمدردی اور محبت کے ذریعے رعایا کو یہ یقین دلائے کہ اس کی ذات ان کے لئے نعمت ہے تاکہ وہ ہر ایک کے دل میں گھر کر لے۔ وہ حلیم و بربار ہو کیوں کہ سلاطین کی تندیٔ مزاج ملک کی بربادی کا باعث ہوتی ہے۔

2۔ شاہ صاحب بادشاہ کو صرف رحم دل اور حلیم نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ اس میں شجاعت و بہادری کا وصف بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ وہ دشمنوں کا مقابلہ کر سکے اور رعیت پر رعب قائم رکھ سکے۔

شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں کہ انسانوں میں حفاظتِ نفس اور بقائے نسل جیسی حیوانی بنیادی خواہشات کے علاوہ کچھ اس کی خصوصی ضروریات بھی ہوتی ہیں جن سے دیگر حیوانات عاری ہوتے ہیں۔ ایسی خواہشات شاہ صاحب کے نزدیک تین ہیں۔

1۔ کسی اصولی نظریہ پر غور و خوض کرنے کے بعد اس کے لئے جدوجہد کرنے کی قوت انسان ہی میں موجود ہے۔ وہ نقصانات صرف اس لئے برداشت کرتا ہے اور مصائب اس لئے جھیلتا ہے کہ اسے آگے چل کر کوئی فائدہ پہنچے گویا کوئی نصب العین متعین کر کے اس کے حصول کے لئے کوشش کرنا صرف انسانوں کا خاصہ ہے۔

2۔ انسان نفاست پسند واقع ہوا ہے۔ اس میں عمدگی اور بہتری کی خواہش موجزن ہے۔ وہ بنیادی خواہشات کی معمولی تکمیل پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ خوراک و لباس اور بود و باش کی بہتر سے بہتر صورت حاصل ہو سکے۔ اس کی فطرت میں تنوع ہے۔

---

[1] ۔ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:233

Rasheed Ahmad,Musalmano ky syāsi Afkār,p:233

3۔ انسانی فطرت میں اشیاء کے خواص کی تحقیق کا شوق ودیعت کیا گیا ہے۔ حیوانات اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا طریقہ فطری الہامات سے سیکھتے ہیں لیکن رہنمائی ان الہامات کے علاوہ عقل و وحی بھی کرتی ہے۔ جن کی مدد سے وہ اپنی خواہشات پوری کرتا ہے اور اس کے لئے نت نئے طریقے بھی تلاش کرتے ہے۔

مذکورہ بالا تینوں انسانی خصوصیات تعامل و تعاون کو اور بھی لازمی بنا دیتی ہیں۔ یہ بھی انسانی معاشرے کے وجود کا باعث بنتی ہے۔

سر سید احمد خان:

برصغیر پاک وہند صدیوں سے بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا اور غالب و مغلوب کے طویل باہمی تعلقات کے دوررس نتائج مرتب ہوئے لیکن جب مغربی اقوام یہاں وارد ہوئیں اور انگریزوں نے اپنا سیاسی تسلط قائم کر لیا تو جدیدیت اور قدامت پرستی جدیدیت کی یہ دیرینہ کشمکش بامِ عروج تک جا پہنچی۔ اس سے کم و بیش ہر شعبہ زندگی متاثر ہوا۔ ان حالات میں محکوم افراد تین نمایاں طبقوں میں بٹ گئے۔ کچھ لوگوں نے نئی اقدار اپنانے سے گریز کیا۔ جب کہ کچھ لوگ اپنی بیشتر روایات چھوڑ کر نئے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال بیٹھے۔ افراط و تفریط کے اس عمل کے ساتھ ساتھ ایک ایسا طبقہ بھی سامنے آیا جو متوازن رویہ اختیار کرتے ہوئے درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس تاریخی موڑ پر سر سید احمد خان جیسی اہم شخصیت منظرِ عام پر آتی ہے۔ جس کی تمام تر مذہبی، تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی کوشش کا مرکز و محور قدیم و جدید کے امتزاج سے حاکم و محکوم کے مابین ہر سطح پر بہتر تعلقات استوار کرنا تھا۔[1]

سر سید ایک متوسط مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت حسینؓ تک پہنچ جاتا ہے۔ سر سید احمد کی تعلیم کی ابتداء قرآن کی تعلیم سے ہوئی۔ پھر انہوں نے دیگر علوم حاصل کئے۔ سر سید نے بے شمار کارنامے سر انجام دیئے۔ ان کی گراں مایہ تصانیف ان کے علمی و ادبی کارناموں پر گواہ ہیں۔[2] سر سید نے اسّی سال کی عمر میں 28 مارچ 1898ء میں علی گڑھ میں وفات پائی۔

سر سید احمد خان نے مذہب و سیاست کے بارے میں جن نظریات کا اظہار کیا وہ ہمارے لیے باعثِ حیرت اجنبی اور غیر مانوس ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں حاکم مصر اسماعیل پاشا، تیونس کے وزیر سید خیر الدین اور متعدد دیگر حکومتوں اور شخصیات کے حوالے دیئے ہیں اور تعریف کی ہے کہ انہوں نے سیاست کو مذہب سے الگ رکھتے ہوئے لادینی حکومت قائم کیں۔[3] حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ تنازعات نے مسلمانوں کے اذہان کو بے حد الجھا دیا تھا۔ لہٰذا ایسے میں جن مسلمانوں نے لادینی حکومت قائم کی یا سر سید نے جو نظریات قائم کئے وہ بلاشبہ اس دور کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ سر سید احمد خان خلافت کو حجت شرعی کے طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ خلافت کو وہ محض دنیاوی حکومت کے انداز میں لیتے ہیں۔ اور خلیفہ کو خلیفۃ اللہ تسلیم کرتے ہیں نہ کہ خلیفۃ الرسول۔ کیونکہ ان کے خیال میں رسول کریم ﷺ کے بعد کوئی شخص من حیث النبوۃ ان کا جانشین نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خلفائے راشدین نے بھی اپنی اپنی خلافت کے دوران جو کچھ کیا اس کی ذمہ داری اسلام پر عائد نہیں ہوتی بلکہ خدا کے سامنے خلفاء خود اپنے افعال کے ذمہ دار ہوں گے۔ اسی بناء پر سر سید احمد خان

1۔ سی، ڈبلیو۔ ٹرول (مترجم: محمد اکرام چغتائی)، سر سید احمد خان، القمر انٹر پرائزز، لاہور، 1998ء، ص: 7

C.W Troll(Mutarjim:Muhammad Ikrām Chughtāi), Sir Syed Ahmad Khan, Al-Qamar Interprize, lahore, 1998, p 7

2۔ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص: 253

Rasheed Ahmad,Musalmano ky syāsi Afkār,p:352

3۔ ایضاً، ص: 261

Ibid, p 261

ازروئے دین یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ کسی شخص کی خلافت کو تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ وہ منصف وعادل خلیفہ کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ جو خلیفہ انصاف سے حکومت کرے۔ دینی فرائض میں مداخلت نہ کرے یا مخل نہ ہو حقوق، جان اور مال کو تحفظ دے۔ وہ یقیناً منصف وعادل ہے۔ سرسید حکمران کو اعلیٰ اوصاف سے متصف دیکھنا چاہتے ہیں وہ حکمران میں وہ تمام اوصاف دیکھنا چاہتے ہیں جن سے ذاتِ الٰہی متصف ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حقیقی سلطنت کا نمونہ اس دنیا میں بادشاہوں کی صورت میں پیدا کیا ہے۔ تاکہ لوگ بادشاہ کو دیکھ کر سب سے بڑے بادشاہ اور حکمران حقیقی، یعنی ذات خداوندی کے اوصاف پہچان کر اس کا شکر بجالا سکیں۔ وہ اس قدیم خیال سے اختلاف کرتے ہیں کہ رعایا پر حکمران کی اطاعت فرض ہے اور جو اس کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ انہوں نے سخاوت، عفوودرگزر اورانصاف کونہایت اہمیت دی ہے۔ حکمران جس قدر سخی ہوگا۔اس قدر فائدے اس کے لئے مقدر ہوں گے۔ یوں نہ صرف حکمران طاقتور ہوتا ہے بلکہ عوام کا حوصلہ بھی بلند ہوجاتا ہے۔

سرسید کے زمانے میں مسلمانوں کی برائے نام حکومت باقی رہ گئی تھی۔ سرسید ان حقائق سے بخوبی آگاہ تھے۔ان کی تمام تر کوشش اس امر پر صرف ہوئی ہے کہ اسلامی سیاسی تصورات کو جدید نظریات سے مسابقت دے دی جائے اور اسلامی قانونِ سیاست کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس میں اور یورپی طرزِ فکر میں ہم آہنگی پیدا ہو۔

سرسید احمد خان کے مطابق حکومت اسی صورت میں مستحکم ہوسکتی ہے جب کہ قائد میں غرور نہ ہو اور وہ اپنے دبدبے کو قائم رکھتے ہوئے اپنی مہربانیوں سے عوام کے دل اپنی مٹھی میں لے لے۔ وہ انہیں مکمل مذہبی آزادی دے۔ ان کے حقوق نہ سلب کرے۔ ان کے جان ومال کا مکمل تحفظ کرے۔ اقتصادی خوشحال پیدا کرے۔ رحم کرے اور عفوودرگزر سے کام لے۔ سرسید احمد خان حکمران کا دبدبہ بھی چاہتے ہیں۔ مگر اس کے لیے سخی اور متواضع، منکسر المزاج اور حلیم الطبع ہونا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

علامہ محمد اقبال:

علامہ محمد اقبال نے برصغیر کے غلامانہ ماحول میں آنکھ کھولی اور عمر عزیز کے مختلف مراحل میں ملت اسلامیہ کی معاشی ابتری، معاشرتی انتشار، سیاسی زوال اور تہذیبی انحطاط کے نقشے دیکھے۔ کتاب وسنت کے مطالعہ نے ان میں وہ حکمت وبصیرت پیدا کی کہ انہوں نے احیائے ملت کے ذریعہ اسلامی ریاست کی تشکیل اوراتحادِ عالم اسلامی کو اپنی منزل ٹھہرالیا۔ اس مقصد وحید کے لئے انہوں نے جہاں نثر میں اپنے افکار کی توضیحات پیش کیں وہاں اشعار کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کے تنِ مردہ میں خون دوڑانے کی سعی کی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی قوم کے عروج کی ترقی کا انحصار اس کی سیاست وقیادت اور اقتدار وقوت پر ہے۔ جو قوم بھی برسرِ اقتدار رہی وہ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرتی رہی۔ لیکن جوں ہی عنان حکومت اس کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھوں میں جا پہنچی عام تباہ کاریوں نے اسے گھیر لیا۔ دینی اور دینوی زندگی کا کوئی پہلو بھی بری طرح متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مسلمان اس قانون سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ہندوستان میں وہ جب تک برسراقتدار رہے شاہراہِ ترقی پر گامزن تھے۔اور جب ان کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو سیاسی، سماجی، تمدنی اور ثقافتی میدانوں میں پستی اوردرماندگی کے ساتھ ساتھ خالص دینی اور مذہبی زندگی میں بھی زوال کے اثرات نمایاں ہوگئے۔ علامہ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کی حیات مستقبلہ کے اس طویل اور کڑے سفر میں 'حدی خواں' بن کے ملی ترانے سنائے۔

چین و مغرب عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا[1]

کتاب وسنت کی روشنی میں اسلامی ریاست کی ہیئت، تنظیم اوراس کے تاریخی وتدریجی ارتقاء کے بارے میں اقبال مکمل آگہی رکھتے تھے۔ خلافت اسلامیہ سے متعلق ان کے مباحث قیام انگلستان (08-1905) کے دورانِ شائع ہونا شروع ہوئے۔ لندن سے شائع ہونے والے علمی اور تحقیقی مجلّے سوشیالوجیکل ریویو(Sociological Review)میں 1908ء میں ان کا مضمون Political Thought in Islam کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون کا اردو ترجمہ اخبار، وکیل، امرتسر میں شائع ہوا۔ اقبال نے اسے ناپسند کیا تو آپ کی فرمائش پر اس کا ترجمہ چوہدری محمد حسین نے 1923ء میں کیا جو "خلافتِ اسلامیہ" کے عنوان سے شائع ہوا اور اب مقالات اقبال کے مجموعوں میں شامل ہے۔ اس مضمون میں اقبال نے اسلام میں خلیفہ کے انتخاب اور اسلامی ریاست کی سیاسی قیادت کی تنظیم و تشکیل پر واضح انداز میں گفتگو کی ہے۔ اقبال شریعت اسلامی کے مطالعہ سے اپنی یہ رائے پختہ کر چکے تھے کہ حکومت واقتدار کی تشکیل ملتِ اسلامی کا حق ہے۔ جو جمہوری اور شورائی اسلوب سے کسی ایک معتبر اور مستحق شخصیت کو منتقل ہوتا ہے جسے وہ ایک حق امانت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس مقالے میں علامہ اقبال نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا وہ خطبہ بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے انتخاب اور تقرر کے بعد مجمع عام میں دیا۔ اس خطبے سے اسلام کے تصور قیادت کے بعض اہم اور اصول مباحث کی توضیح ہو جاتی ہے۔ خطبے کے یہ الفاظ توجہ طلب ہیں۔

"آج سے میں تمہارا حکمران ہوں اگرچہ تم سب میں قابل ترین نہ ہوں، اگر میں شریعت کے مطابق عمل کروں تو میری مدد کرو اور میرا ہاتھ بٹاؤ۔ اگر شریعت کے خلاف جاؤں مجھے روکو اور میری اصلاح کرو۔ حق کی اطاعت کرو کیونکہ حق ہی میں ہدایت وایمان ہے۔ باطل سے بچو کیونکہ باطل ضلالت ومنافقت کا سرچشمہ ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں خدا اور رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔ جس معاملہ میں مَیں خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف کروں تم میری اطاعت ترک کر دو۔[2]

سربراہِ مملکت کے انتخابی طریق کار کے بارے میں اقبال لکھتے ہیں:

ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام ابتداء ہی میں اس اصول کو تسلیم کر چکا تھا کہ فی الواقع اور عملاً سیاسی حکومت کی کفیل وامین ملت اسلامیہ ہے نہ کہ کوئی خاص فرد واحد، ہاں جو عمل انتخاب کنندگان اس معاملہ میں کرتے ہیں اس کے معنی صرف یہی ہیں کہ وہ اپنے متحدانہ آزادانہ عمل انتخاب سے اس سیاسی حکومت کو ایک ایسی مختصر ومعتبر شخصیت میں ودیعت کر دیتے ہیں جس کو وہ اس امانت کا اہل تصور کرتے ہیں۔ یوں کہو کہ تمام ملت کا خمیر اجتماعی اس ایک فرد یا شخصیت منفردہ کے وجود میں عمل پیرا ہوا ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں

---

1. محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال، الفیصل اردو بازار لاہور، 1995ء، ص:197
Muhammad Iqbāl,Alāma, Quliyāt-i-Iqbal ,Al-Fesal Urdu Bāzar Lahore

2. مقالات اقبال، مرتبہ؛ سید عبد الواحد معینی، القمر انٹر پرائزرز لاہور، 2011ء، ص:88
Maqalaat e Iqbal, martba; Syed Abdul Wahid Mueeni, Al Qamar Interprisers,Lahore,2011,p 88

حقیقتاً اور صحیح معنوں میں فرد تمام کی تمام قوم کا نمائندہ کہلا سکتا ہے۔ البتہ اس کو ان افراد پر
جن کا وہ نمائندہ ہے سوائے اس حکومت کے جو شرعاً آئین کے نافذ کرنے کی غرض سے
اسے حاصل اور کوئی اختیار واقتدار نہ ہو گا۔[1]

ان اقتباسات سے اسلام کے تصور قیادت کے خدوخال واضح ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں حکمرانی اور قیادت کو جو شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ مطلق العنان بادشاہوں اور سلاطین کی ہیں لیکن اسلامی قیادت کا تصوراور نقشہ ان سب سے بہت مختلف ہے۔ اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ قیادت اور حکمرانی کے مسئلہ پر علامہ اقبال کے افکاراورآراء آیات قرآنی اوراحادیث نبوی پر مشتمل ہیں۔ قیامِ انگلستان سے ہندوستان واپسی تک اقبال نے اس موضوع کو اپنے غوروفکر کا حصہ بنایا اور اس پر نظم ونثر میں متعدد مواقع اور مقامات پر تذکرہ کیا ہے۔ حکمرانی اوراس کے آداب پر اسلامی لٹریچر میں بیسیوں کتابوں اور تالیفات کا تذکرہ ملتا ہے۔ علامہ نے لٹریچر کو بخوبی دیکھا اور پڑھا اور گاہے گاہے اس کے نتیجے میں امتِ مسلمہ کی رہنمائی کے لئے اپنے نتائج افکار کو پیش کیا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمیعت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمیعت تری[2]

علامہ اقبال اسلامی ریاست کے لئے ایک ایسی قیادت کے خواہاں تھے جو مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکے۔ ان کے نزدیک ایسے عالمگیر نظام کا قائم ہونا انفرادی سلطنتوں کے حقوق اقتدار کے منافی نہیں ہے۔[3] اس سلسلے میں علامہ اقبال نے سید جمال الدین افغانی کے اس تصور کو بھی قبول کیا کہ مکہ مکرمہ مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کا مرکز رہے گا۔ لیکن اقبال نے اتحاد اسلامی کی مرکزیت کے لئے تاریخِ اسلام کے قرون اولیٰ کے نظام خلافت کا تصور پیش نہیں کیا۔ اپنے عہد کے دیگر قائدین کے مقابلے میں خلافت کے متعلق اقبال کا اپنا علیحدہ نقطہ نظر تھا۔[4]

عرب خود را بہ نور مصطفیٰ سوخت
چراغ مردہ مشرق بر افروخت
ولیکن آں خلافت را گم کرد

---

1 ۔ ایضاً، ص:89

Ibid,p 89

2 ۔ کلیاتِ اقبال، ص:299

Quliyaat e Iqbal, p 299

3 ۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی، اسلامی ریاست، ایک تاریخی جائزہ، ص:42-51

Dr Ameer Hassan Sadiqui,Islami Riyasat;aik Tareekhi Jaaiza,p 42-51

4 ۔ ڈاکٹر معین الدین، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، س ن، ص:206-205

Dr Moeen Ud Din, Iqbal aur Jadeed dunya e Islam,Maktba Tameer e Insaniyat,Lahore,p 205-206

که اول مومناں را شاہی آموخت
خلافت بر مقام ما گواہی است
حرام است آنچه بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ
حفظ ناموس الٰہی است[1]

علامہ اقبال کے نزدیک یہ تمام مملکت خدا کی ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ اور حق حکمرانی بھی صرف اسی کو ہے۔ اہلِ زمین کے پاس یہ اقتدار ایک امانت ہے جسے شریعت کی حدود و قیود میں استعمال ہونا چاہیے۔ یہ افکار اقبال کے ہاں شعر کی زبان میں یوں ڈھلے ہیں۔

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کاز تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست[2]

خدا کی حکمرانی کے اس تصور کو علامہ اقبال "جاوید نامہ" کی تین نظموں، خلافت آدم، حکومت الٰہی، اور "افکار ملک خدا است" میں پیش کیا ہے۔

مده خلافت ، فقر با تاج و سریر است
زہے دولت کہ پایاں ناپذیر است
جواں بختا مده از دست ایں فقر
کہ بے او پادشاہی زود میر است[3]
ہنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کارش نا تمام است
غلام فقر آں گیتی پناہم

[1] ۔ محمد اقبال، علامہ، ارمغان حجاز، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، 1982ء، ص: 126
Muhammad Iqbal,Allama,Armghan e Hijaz,Aiteqaad Publishing House,Dehli,1982,p 126

[2] ۔ کلیات اقبال، ص: 299
Kuliyaat e Iqbal,p 299

[3] ۔ ارمغانِ حجاز، ص: 941
Armghaan e Hijaz,p 941

کہ در دینش ملوکیت حرام است[1]

اسلامی تعلیمات کے مطالعے کے بعد اقبال یہ بخوبی جان چکے تھے کہ اسلام میں حکمرانی کا تصور عوامی خدمت کے ساتھ وابستہ ہے۔ 1923ء میں "پیامِ مشرق" شائع ہوئی اس کی ابتداء میں جو اشعار کہے ہیں ان میں درج ذیل اشعار سروری اور خدمت گری کے تصور کی وضاحت کرتے ہیں۔

سروری در دین ماخدمت گری است
عدلِ فاروقی و فقر حیدری است[2]

فقر و شاہی یا یہ حسین امتزاج اسلام کے تصور قیادت کی امتیازی شان ہے۔ اسلامی قیادت کی یہی وہ خصوصیت ہے جس سے خلافت راشدہ کا تاریخی عہد تابندہ در خشندہ ہے۔

فقر و شاہی کے موضوع پر اقبال کے اردو کلام میں بھی فکر وانگیز مضامین بیان ہوئے ہیں۔

سروری در دین ماخدمت گری است
عدلِ فاروقی و فقر حیدری است[3]

مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یہ نہ مانے، میرو سلطان سب گدا[4]

اقبال کے اردو کلام میں بھی اسلامی حکمرانی کے طریق، فرائض اور شرائط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا[5]

سبق پڑھ پھر صداقت کا ، عدالت کا ، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا[6]

1۔ اسرار و رموز، ص:44-45

Israar o Ramooz , 44-45

2۔ پیامِ مشرق، کلیات اقبال، ص:190

Piyam e Mashriq, Kuliyaat e Iqbal, p 190

3۔ کلیاتِ اقبال، ص:401

Kuliyaat e Iqbal, p 401

4۔ ایضاً، ص:319

Ibid, p 319

5۔ ایضاً، 320

Ibid, p 320

6۔ ایضاً

Ibid

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بے زار کرے[1]

علامہ اقبال کے ہاں تصور قیادت پر بہت بھرپور انداز میں علمی اور تاریخی حوالے سے بحث ملتی ہے۔ اسلامی حکمرانی کا مقصد، خلافت کی حقیقت، دین وسیاست فقر وشاہی، اخوت ومساوات، اقتدار کی فناپذیری، قیادت کی صفات، حکمرانوں کے مستقبل کا منشور اور طرزِ حکومت کی مختلف شکلوں اور صورتوں جیسے اہم موضوعات پر اقبال کے ہاں نظم ونثر میں واضح خیالات ملتے ہیں۔ اقبال اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ کے قائل تھے۔ اللہ تعالیٰ کی حقیقی حکمرانی کے علاوہ باقی سب کو وہ بتان آزری قرار دیتے ہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے ام وہی باقی بتانِ آزری
ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری[2]

مولانا ابو اعلیٰ مودودی:

مولانا مودودی نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں ایک تاریخ ساز انسان کی حیثیت سے معروف ومتعارف ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے فکر وعمل کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق صحیح سمت عطا کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جدوجہد کے نئے رُخ متعین کئے ہیں۔ فکر ونظر کوئی گوشہ، سعی وعمل کی جولانگاہ ایسی نہیں جو مولانا کے افکار ونظریات سے متاثر نہ ہو۔ سیاست بھی چونکہ دین کا ہی ایک حصہ ہے۔ اس لئے مولانا نے سیاسی اور دستوری مسائل پر بھی بڑی شرح وسط کے ساتھ فکر انگیز بحث کی ہے۔ وہ اس صدی کے بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم سیاسی مفکر بھی تھے۔ انہوں نے اسلام کے سیاسی نظریات کو اپنی مختلف تصانیف میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مولانا مودودی نے اپنی کتاب "اسلامی ریاست" میں اسلامی ریاست کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآنی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ دین اور سیاست وجداگانہ چیزوں کا نام نہیں۔ بلکہ ایک ہی چیز اور لازم وملزوم وہ لکھتے ہیں۔

"ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے جو خداوندِ عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہے۔"[3]

---

[1] ۔ کلیاتِ اقبال:ص:553

Kuliyaat e Iqbal, p 553

[2] ۔ کلیاتِ اقبال،ص:312

Kuliyaat e Iqbal,p 312

[3] ۔ حمید اللہ،ڈاکٹر،اسلامی ریاست،بیروت،س ن،ص:49

Hameed Ullah,Dr,Islami Riyasat,berut,p 49

مولانا مودودی قرآنی دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ مقتدرِ اعلیٰ اللہ ہی کی ذات ہے۔اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے اور خلق اسی کی ہے اسی لئے مالکِ حقیقی کے ہوتے ہوئے اس دنیا کا کوئی دوسرا مالک نہیں کر سکتا۔اور نہ ہی کسی کو حکم جاری کرنے کا اختیار حاصل ہے۔اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا مقتدرِ اعلیٰ اور بادشاہ ہے،اس کے حکم میں کوئی شریک نہیں۔قانون سازی کا اختیار صرف اور صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔وہ کہتے ہیں جن امور میں اللہ اوراس کے رسول نے کوئی صریح حکم نہ دیاہو اس میں شریعت اور مزاج اسلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون بنانے کا حق اہلِ ایمان کو حاصل ہے۔قانونِ الٰہی کی حدود کے اندر استنباط واجتہاد سے تفصیلات فقہی مرتب کرنے کی اجازت ہے۔البتہ قرآن وسنت سے متضاد و متصادم کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔

مولانا مودودی کہتے ہیں کہ زمین کا مالک اللہ ہے اس کی زمین میں رہنے،اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق صرف اسی کو ہے جو اس کا مطیع ہو اور اس کے قانون فطری وشرعی کا اتباع کرتا ہو۔مولانا کا خیال ہے کہ خلافت وقیادت کے حقدار بالخصوص انبیائے کرام ہیں پھر عمومی طور پر مسلمان۔قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں۔اللہ نے ان سے وعدہ کیاہے کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔اسی طرح جس طرح پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا۔"[1]

مولانا مودودی کہتے ہیں کہ یہاں خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیاہے۔یہ نہیں کہا گیا کہ ان میں سے کس کو خلیفہ بناؤں گا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام مومن خلافت کے حامل ہیں۔ہر وہ شخص جو اللہ کے احکام کی پیروی کرتا ہے وہ اس کا عمومی خلیفہ بن جاتا ہے۔کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کرکے انہیں اپنے مرکوز کرلینے کا حق نہیں ہے۔نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی خصوصی خلافت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔یہی چیز اسلامی خلافت کو ملوکیت،طبقاتی حکومت اور مذہبی پیشواؤں کی حکومت سے الگ کرکے اسے جمہوریت کے رخ پر موڑتی ہے۔لیکن اس میں اور مغربی جمہوریت میں اصولی فرق یہ ہے کہ مغربی تصور کی جمہوریت عوامی حاکمیت کے اصول پر قائم ہوتی ہے اوراس کے برعکس اسلام کی جمہوری خلافت میں عوام خدا کی حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے اپنے اختیارات کو برضاورغبت قانونِ خداوندی کی حدود میں محدود کرلیتے ہیں۔[2]یعنی تمام عمومی خلفاء مل کر ایک خاص خلیفہ چن لیں تو خلافت وجود میں آتی ہے۔گویا ان کے نزدیک خلافت اور عام دنیاوی ریاست میں یہ فرق ہوا کہ دنیاوی ریاست کے اپنے بنائے قوانین اور رسوم ورواج پر عمل کیا جاتا ہے۔لیکن اس کے برعکس اسلامی ریاست وہ نظامِ حکومت ہے جس میں قوانین الٰہی پر عمل کیا جاتا ہے۔دنیاوی ریاست کا ایک مقتدر اعلیٰ (بادشاہ) ہوتا ہے جو مطلق العنان ہوتا ہے اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا،جب کہ اسلامی ریاست کا مقتدرِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے۔خلیفہ صرف اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے جو انسان کے سامنے بھی جوابدہ ہوتا ہے اوراللہ تعالیٰ کے سامنے بھی۔

مولانا مودودیؒ کا خیال ہے کہ رئیس مملکت کا انتخاب عام لوگوں کی رضامندی پر منحصر ہے۔کوئی شخص خود زبردستی امیر بن جانے کا حق نہیں رکھتا اور کسی خاندان یا طبقے کی اس منصب پر اجارہ داری نہیں۔انتخاب کسی جبر کے بغیر مسلمانوں کی آزادانہ رضامندی سے ہونا

---

[1] ۔ النور،55/24

Surah Al Noor:24:55

[2] ۔ مودودی،ابوالاعلیٰ،سید،خلافت وملوکیت،ایچ فاروقی ایسوسی ایٹس لاہور،1986ء،ص:36

Moududi,Abu Al Alaa,Syed,Khilafat o Malukiyat,H Farooqi Associates,Lahore,1986,p36

چاہیے۔ اسی طرح مولانا نے قرآن وسنت سے ثابت کیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت صرف معروف میں ہے۔ معصیت میں نہیں۔ اگر اولی الامر قرآن وسنت کے خلاف کام کرے یا فلاح عامہ یا ریاست کے خلاف کرے تو اسے برطرف کیا جاسکتا ہے۔

آپ ریاست کا نظام چلانے کے لیے اُولی الامر کی درج ذیل صفات بیان کرتے ہیں:

☆ وہ ان اصولوں کو مانتے ہوں جن کے مطابق خلافت کا نظام چلانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی جارہی ہے، اس لیے کہ ایک نظام کو چلانے کی ذمہ داری اُس کے اصولی مخالفین پر نہیں ڈالی جاسکتی:

يَا أَيُّهَا ٱلَّذِينَ آمَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَأُوْلِى ٱلأَمْرِ مِنْكُمْ۔[1]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو۔ رسول کی اور اُن کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔"

يٰأَيُّهَا ٱلَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ بِطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ۔[2]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے سوا دوسروں کو شریکِ راز نہ بنالو۔"

☆ یہ کہ وہ ظالم، فاسق وفاجر، خدا سے غافل اور حد سے گزرجانے والے نہ ہوں بلکہ ایمان دار، خدا ترس اور نیکوکار ہوں۔ کوئی ظالم یا فاسق اگر امارت یا امامت کے منصب پر قابض ہو جائے تو اس کی امارت اسلام کی نگاہ میں باطل ہے۔

وَلاَ تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَٱتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطاً۔[3]

"اور تو اطاعت نہ کر کسی ایسے شخص کی جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کی ہے اور جس کا کام حد سے گزرا ہوا ہے۔"

وَلاَ تُطِيعُوٓاْ أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ٱلَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِى ٱلأَرْضِ وَلاَ يُصْلِحُونَ۔[4]

"اور اطاعت نہ کر اُن حد سے گزرجانے والوں کی جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔"

☆ وہ نادان اور جاہل نہ ہوں بلکہ ذی علم، دانا اور معاملہ فہم ہوں اور کاروبارِ خلافت کو چلانے کے لیے کافی ذہنی اور جسمانی اہلیت رکھتے ہیں:

وَلاَ تُؤْتُواْ ٱلسُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ ٱلَّتِى جَعَلَ ٱللَّهُ لَكُمْ قِيَاماً۔[5]

"اپنے اموال، جنہیں اللہ نے تمہارے لیے ذریعۂ قیام بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو۔"

---

[1] ۔ النساء:59:4
Surah Al Nisa:4:59

[2] ۔ آل عمران،118:3
Surah Al e Imran:3:118

[3] . الکہف،28:18
Surah Al Kahf:18:28

[4] . الشعراء:152:151
Surah Al shu’ra:152

[5] ۔ النساء،25:4
Surah Al Nisa:4:25

قَالُوٓاْ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ ٱلْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِٱلْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ ٱلْمَالِ قَالَ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِى ٱلْعِلْمِ وَٱلْجِسْمِ۔[1]

"(بنی اسرائیل نے کہا) اس (یعنی طالوت کو) ہم پر حکومت کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا، حالانکہ ہم نے اس کی بہ نسبت بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں اور اسے مال میں کوئی کشادگی نہیں دی گئی ہے۔ نبی نے کہا اللہ نے اسے تمہارے مقابلہ میں برگزیدہ کیا ہے اور اسے علم اور جسم میں کشادگی دی ہے۔"

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ ٱلْحِكْمَةَ وَفَصْلَ ٱلْخِطَابِ۔[2]

"اور داؤد کی بادشاہی کو ہم نے مضبوط کیا اور اسے حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔"

قَالَ ٱجْعَلْنِى عَلَىٰ خَزَآئِنِ ٱلأَرْضِ إِنِّى حَفِيظٌ عَلِيمٌ۔[3]

"یوسفؑ نے کہا کہ مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دے، مَیں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں۔"

وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى ٱلرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُوْلِى ٱلأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ ٱلَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ۔[4]

"اور اگر یہ لوگ (افواہیں اُڑانے کے بجائے) اس خبر کو رسول تک اور ان لوگوں تک پہنچاتے ہیں ان میں سے اولیٰ الامر ہیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجاتی جو ان کے درمیان بات کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں۔"

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى ٱلَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَٱلَّذِينَ لاَ يَعْلَمُونَ۔[5]

"کہو، کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں؟"

☆ وہ ایسے امانت دار ہوں کہ ذمہ داریوں کا بوجھ اُن پر اعتماد کے ساتھ رکھا جاسکے:

إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّواْ ٱلأَمَانَاتِ إِلَىٰٓ أَهْلِهَا۔[6]

"اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے حوالے کرو۔"

1۔ البقرہ،247:2
Surah Al Baqarah:2:247

2۔ صٓ،20:38
Surah Suad:38;20

3۔ یوسف،55:12
Surah Yousuf:12:55

4۔ النساء،83:4
Surah Al Nisa:4:83

5۔ الزمر،9:39
Surah Al Zumar:39:9

6۔ النساء،58:4
Surah Al Nisa:4:58